Al-Aijaz Research Journal of Islamic Studies & Humanities
(Bi-Annual) Trilingual: Urdu, Arabic and English
ISSN: 2707-1200 (Print) 2707-1219 (Electronic)
Home Page: http://www.arjish.com
Approved by HEC in "Y" Category
Indexed with: IRI (AIOU), Australian Islamic Library, ARI, ISI, SIS, Euro pub.
Published by the Al-Khadim Foundation which is a registered organization under the Societies Registration ACT.XXI of 1860 of Pakistan
Website: www.arjish.com
Copyright Al Khadim Foundation All Rights Reserved © 2020
This work is licensed under a
Creative Commons Attribution 4.0 International License

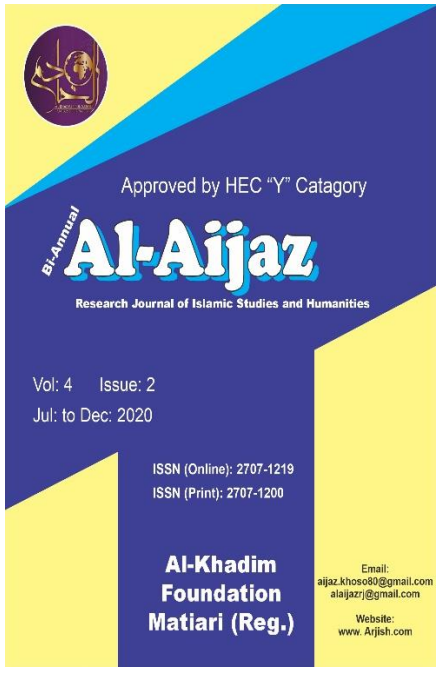

TOPIC:

Autobiography of Fiker Taunsvi: Critical Analysis

AUTHORS:

1. Ghulam Asghar, Ph.D Scholar (Urdu), Allama Iqbal Open University, Islamabad.
Email: gh.kulachi@gmail.com

How to cite:
Asghar, G. (2020). U-25 Autobiography of Fiker Taunsvi: Critical Analysis. *Al-Aijaz Research Journal of Islamic Studies & Humanities*, *4*(2), 376-391.
https://doi.org/10.53575/u25.v4.02(20).376-391

URL: http://www.arjish.com/index.php/arjish/article/view/172

Vol: 4, No. 2 | July to December 2020 | Page: 376-391

Published online: 2020-12-20

QR Code

فکر تونسوی کی خود نوشت سوانح عمری: تجزیاتی مطالعہ

Autobiography of Fiker Taunsvi: Critical Analysis

Ghulam Asghar*

Abstract

Fiker Taunsvi started his writing career as a newspaper reporter, editor and columnist. He has witnessed crisis of division of India. His writing career and his first hand experience of soul stultifying catastrophe that humanity underwent in his life compelled him to write satire. Satire helped him to express his hatred both for social situation and the writers who tended to project a glorious future. His autobiography is satire in itself on art of writing biographies. He stated that autobiographies should not be taken true because the events stated in these could not be historically true. These should be taken artistic creation as any other piece of art created by artist. This study "AUTOBIOGRAPHY OF FIKER TAUNSVI: CRITICAL ANALYSIS" explores the art of writing autobiographies and the life of author described in it. In this research study researcher has explored upbringing and personality of author and life and social situation which author witnessed in his life.

Keywords: Autobiography, soul, upbringing, catastrophe, humanity.

فکر تونسوی(1918ء۔1987ء)کا شمار بر عظیم پاک وہند کے چند ممتاز طنز ومزاح نگاروں میں ہوتا ہے۔اگرچہ انہوں نے شاعری، خاکہ ،رپورتاژ،ناول، تنقید، سفر نامہ، سوانح، آپ بیتی اور مکاتیب کی صورت میں قیمتی اثاثہ چھوڑا ہے۔ فکر تونسوی پاک وہند کے مشہور اخبارات ورسائل جیسے ادب لطیف، سویرا،ادبی دنیا، معیار، افکار، نقوش، شگوفہ، شاعر، شاہراہ، بیسوی صدی، چنگاری اور روزنامہ امروز، رفتار، نیادور، نیازمانہ، آج کی خبر اور ملاپ میں تمام عمر لکھتے رہے۔انہوں نے ریڈیو، ٹیلی ویژن اور سٹیج کے لیے بھی کئی ڈرامے تخلیق کیے۔ چنگاری کا ضخیم کالم نگاری نمبر اور شاہراہ دہلی کا طنز ومزاح نمبر مرتب کیا۔ مگر ان کی پہچان طنز ومزاح نگاری ہی ٹھہری۔ فکر تونسوی کی متفرق تصنیفات میں ہیولے(شعری مجموعہ)، چھٹا دریا(رپورتاژ)، خدوخال(خاکے)، ماؤسی تنگ(سوانح)، پروفیسر بدھو (ناول)، چوپٹ راجہ(ناول)، پنجاب کو سلام(ناول)، میں(خود نوشت)، میری بیوی(خود نوشت) شامل ہیں جبکہ طنز ومزاح پر مشتمل کتابوں میں ساتواں شاستر، تیر نیم کش، چاند اور گدھا، وارنٹ گرفتاری، پیاز کے چھلکے، فکریات، چھلکے ہی چھلکے، آدھا آدمی، کفن سے کرتے تک، بات میں گھات، فکر بانی، فکر نامہ، ماڈرن الٰہ دین، بدنام کتاب، گھر میں چور نمایاں ہیں۔

اگرچہ فکر تونسوی نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی مگر ان کی طنز ومزاح نگاری کو اس قدر پذیرائی اور شہرت نصیب ہوئی کہ ان کی دیگر تخلیقات کی طرف کسی کو آنکھ اٹھا کر دیکھنا کا موقع ہی نہ ملا خود فکر نے بھی باقی اصناف نظم ونثر کو تقریباً ترک ہی کر دیا۔ فکر تونسوی کو فطرت نے ادیب ہی پیدا کیا تھا۔ وہ جس صنف نثر و نظم کو اپناتے اسی میں کامیاب رہتے۔اگر فکر شاعری ترک نہ کرتے تو وہ فیض احمد فیض، ن۔م

*Ph.D Scholar (Urdu), Allama Iqbal Open University, Islamabad.
E-mail: gh.kulachi@gmail.com

راشد اور علی سردار جعفری کے ہم پلہ ہوتے۔ فکر تونسوی نے شاعری، خاکہ نگاری، رپورتاژ نگاری، شخصیت نگاری کے ساتھ ساتھ اپنی خود نوشت سوانح عمری "میں" اور "میری بیوی" کے نام سے زیب داستان کی ہے۔

لایا ہے میرا شوق مجھے پردے سے باہر
میں ورنہ وہی خلوتی راز نہاں ہوں
(میر تقی میرؔ)

انسان کا شوق اسے پردے سے باہر لایا اور اس کے اندر پایا جانے والا جوش اپنے ہم نفساں سے مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ میں کون ہوں۔ اظہار ذات یا نمایاں ہونے کی خواہش نے انسان کو ہمیشہ بے تاب رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ خود ہر گزرنے والے واقعات اور مشاہدات میں دوسروں کو شریک کرنا چاہتا ہے۔ خود اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی زندگی کی کہانی خود نوشت یا آپ بیتی کہلاتی ہے۔

مشفق خواجہ نے آپ بیتی کو اس طرح بیان کیا ہے:

"انسان کی دل چسپی کا سب سے بڑا مرکز خود اس کی اپنی ذات ہے اور سب سے بڑا خوف انکشاف ذات کا ہے۔ وہ کسی قیمت پر بھی گوارا نہیں کرتا کہ اس کی ذات اپنی تمام خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ دوسروں کے سامنے آئے یہاں تک کہ وہ خود اپنے آپ سے بھی اپنے کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔۔۔ خود نوشت سوانحی عمری کا اصل مقصد انکشاف ذات ہے لیکن سماجی قیود اور اخلاقی مفروضات اسے پردہ ذات بنا دیتے ہیں"۔[1]

سچ لکھنا اور اپنی شخصیت کے کمزور پہلو لکھنا بہت جرات آمیز کام ہے۔ اگرچہ ہر خود نوشت سوانح نگار حقائق کو جوں کا توں پیش کرنے کا دعویٰ کرتا ہے اور خود کو صاف گو اور راست باز ظاہر کرتا ہے۔ مگر حقیقت میں ایسا کرنا ناممکن ہے۔ انسان کئی باتیں خود سے بھی چھپاتا ہے۔ زندگی کے کئی معاملات ایسے ہوتے ہیں۔ جن کے ظاہر کرنے سے تنازع پیدا ہونے کا خدشہ ہوتا ہے۔ کبھی حقائق بیان کرنے سے دل شکنی کا اندیشہ ہوتا ہے۔ کبھی حقائق بیان کرنے سے دل شکنی کا اندیشہ ہوتا ہے اور کچھ واقعات ایسے شرمناک ہوتے کہ ان کو بیان کرنا دل پر پتھر رکھنے کے مترادف ہوتا ہے۔ خود نوشت اس وقت لکھی جاتی ہے جب صاحب سوانح بوڑھا ہو چکا ہوتا ہے اور وہ معاشرے کا ایک معزز فرد بن چکا ہوتا ہے۔ اس وقت ایسے حقائق کو لکھنا ناممکن ہے۔ روسو نے اپنی آپ بیتی ''اعتراف'' میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ اپنے عیب و ہنر کو من و عن بیان کیا ہے۔

چنانچہ روسو لکھتا ہے:

"میں نے سچائی اور پوری آزادی کے ساتھ اپنے عیب و ہنر کو بیان کیا ہے۔ میں نے اپنا کوئی جرم نہیں چھپایا۔ میں نے اپنی خوبیوں کو بڑھا چڑھا کر بیان نہیں کیا اور اگر کہیں میں نے زیب داستان کا ارتکاب کیا ہے تو محض اس وجہ سے کہ بعض بعض موقعوں پر میری یاد نے میرا ساتھ نہیں دیا"۔[2]

عیسائیت میں اعتراف جرم (confession) مذہبی معاملہ ہے جو شخص پوپ کے سامنے اپنے گناہوں کا اعتراف کر لیتا ہے تو اس کے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ جس طرح روسو نے اپنی خود نوشت The Confession اور ٹالسٹائی نے A Confession میں اپنے

معائب کو کھل کر پیش کیا۔ مشرقی ادیب ایسا نہیں کر سکتے۔ یہ فرق اس لیے ہے کہ مشرق میں جو چیزیں Taboos سمجھی جاتی ہیں مغرب میں ان کو زیر بحث لانا معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ مغرب میں جنسی معاملات کو بیان کرنا مشکل کام نہیں لیکن مشرقی روایات مغرب سے بالکل مختلف ہیں۔ یہاں تو اچھائیوں کا لبادہ اوڑھے بغیر زندگی ناممکن ہے۔ اس لیے مشرق کے ناموران کا سچائی بیان کرنے کا دعویٰ باعث حیرت ہوتا ہے۔ اس لیے یہاں آپ بیتی تو اظہار ذات کی بجائے اخفائے ذات سمجھا جاتا ہے۔

اس لیے فکر تونسوی نے اپنی خودنوشت سوانح عمری کے پہلے حصہ "میں" کا انتساب اس ٹریجڈی کے نام۔۔۔ کہ اس آپ بیتی میں جتنا جھوٹ بول سکتا تھا اتنا نہیں بول سکا" کیا ہے اور جملہ حقوق جھوٹی آپ بیتیاں لکھنے والوں کے نام کیا ہے۔ فکر نے پیارے قارئین کے نام سے پیش لفظ تحریر کیا ہے جسے پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ مصنف آپ بیتی کے فن سے واقف ہیں۔ آپ بیتی کے فن کی پہلی خوبی سچائی شمار کی جاتی ہے۔ اگرچہ ہر مصنف کا یہ دعویٰ ہوتا ہے کہ اس نے اپنی آپ بیتی میں جو کچھ کہا سچ کہا مگر خودنوشت کے فن پر کام کرنے والے ناقدین کا کہنا ہے کہ مکمل سچ بولنا انسان کے بس کا کام نہیں۔ اس لیے فکر تونسوی نے انتساب میں یہ تسلیم کیا ہے کہ اس آپ بیتی میں اتنا جھوٹ نہیں بول سکا جتنا بول سکتا تھا۔ دراصل وہ اُن خودنوشت نگاروں پر طنز کر رہے جو مکمل سچائی کا دعویٰ کرتے ہیں۔ مصنف نے اس دیباچے میں یہ بھی بتایا کہ آخر ہر مصنف آپ بیتی کیوں لکھنا چاہتا ہے۔ ان کا خیال ہے جب ادیب بوڑھا ہو جاتا ہے تو اس کے پاس قابل غور کام نہیں ہوتا۔ دودھ کی بوتل لینے یا آپ بیتی لکھنے کے سوا اس کے پاس کوئی کام نہیں ہوتا۔

"ادیب جب اپنی عمر کی آخری منزل پر پہنچتا ہے تو اس کا جی چاہتا ہے کہ وہ آپ بیتی لکھے کیونکہ اول تو اس کے پاس کوئی قابل غور کام نہیں ہوتا بلکہ وہ جو کام بھی کرتا ہے اسے قابل غور نہیں سمجھا جاتا"۔[3]

فکر تونسوی کے نزدیک آپ بیتی لکھنے کی دو وجوہات ہوتی ہیں ایک تو مصنف کی فراغت اور دوسرا مصنف کو زندگی کے آخری مرحلے پر جھوٹ کو سچ بنا کر پیش کرنے میں مہارت حاصل ہو جاتی ہے۔

"اس کے علاوہ عمر کی آخری منزل میں اہل قلم کا جی اس لیے بھی آپ لکھنے کو چاہتا ہے کیونکہ اس میں جھوٹ اور سچ کی کافی پرکھ ہو جاتی ہے۔ اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ جھوٹ کب بولا جائے کہ وہ سچ معلوم ہو اور سچ کب بولا جائے۔۔۔۔؟ بولا بھی جائے یا نہیں کیونکہ اس سے تو کوئی خاص فرق تو پڑتا نہیں"۔[4]

آپ بیتی کو مسیحیت کی تقلید میں اعتراف جرم کہا جاتا ہے۔ مگر فکر کے نزدیک آپ بیتی صرف گناہوں کا اعتراف نہیں بلکہ ثوابوں کا بھی اعتراف ہے۔

"مگر میرا خیال ہے کہ یہ آپ بیتی لکھنے پر بھی خدا مجھے معاف نہیں کرے گا کیونکہ اس میں فقط میرے گناہوں کا اعتراف نہیں ہے، ثوابوں کا اعتراف بھی شامل ہے"۔[5]

فکر تونسوی نے اپنی آپ بیتی کے پہلے حصے "میں" کو درج ذیل عنوانات کے تحت زیبِ قلم کیا ہے:

ستر سال پہلے، میرا گھرانہ، معاشرہ اور والد صاحب، جھوٹی تاریخ پیدائش، میرا گاؤں، ہندو پانی مسلمان پانی، گاؤں میں رومانس، گاؤں کا اخلاق، شعور کی پہلی آنکھ، چاندنی سے دادی تک، مکان آبائی نہیں ہوتے، میری پیدائش منحوس تھی، میرا ایک اور گاؤں، میرے ماموں جان، مدرسے میں پہلا دن، گم شدہ پنسل کچہری میں، خدا کی مجبوری، میرا اصلی گاؤں، نہ تیری نہ میری، بے علم عالمی، ڈھولن اور نوراں، غلطی میری تھی، میرا مستقبل کیا؟، عشق کی سیاہی، شاعر کے ہاتھ میں ترازو، جُھپ، کل بھی آج بھی، باپو یہ سب کیا ہے، بادشاہ، رعایا کی عزت کرے، ترازو اور دیوان غالب، بنسری اور بھوک، لوٹ کے بدھو، میں نااہل نکلا، حکیم کی حکمت عملی، گائے مقدس بزنس جھوٹ، لائل پور شہر میں، بغاوت اور سامراج، شیر بڑا، میں چھوٹا، مگر میں بھی بڑا، بھوکے شاعر نے رنگ ریزی کی، لالہ صحرائی کی جدوجہد، لاہور کا جوذکر کیا، لاہور کی خوشگواریاں، واہ لاہور آہ لاہور۔

پہلے حصے کے صفحات کی تعداد دو سو چوبیس ہے۔ فکر تونسوی نے اپنی خود نوشت کے پہلے حصے میں اپنے گھرانے یا خاندان کے حالات وواقعات سے بات شروع کی ہے۔ جس میں اس نے اپنے خاندان کے حالات بیان کرتے ہوئے پورے وسیب کے حالات کی عکاسی کی ہے۔ فکر تونسوی تونسہ شریف میں پیدا ہوا۔ تونسہ شریف غربت زدہ علاقہ اب بھی ہے مگر فکر تونسہ کے بچپن، لڑکپن 1918ء سے 1947ء کے درمیان یہاں کی پسماندگی اور غربت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ فکر تونسوی نے اپنے گھرانے کے حالات بیان کرتے ہوئے اس دور کی سماجی اور اقتصادی تاریخ کو بیان کیا ہے۔ اس کے والد کی شرافت اور عسرت، اس کی والدہ کی اکڑفوں، اس کی چچی کا شعلہ پن، بھاوج کا لاغرپن اور کمزوری، اس کے چچا کا غرور تکبر اس کے ماموں حکیم ٹیکارام کی ذہانت، اس کے بھائی ڈھولن کے رومانس میں اس وقت کے تونسہ کے پورے خدوخال چمکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اپنے خاندان کے متعلق وہ لکھتے ہیں:

"میں جس گھرانے میں پیدا ہوا۔ وہ مجھے کچھ خاص پسند نہیں آیا۔ لیکن میں نے اپنی ناپسندیدگی کا واضح اظہار کبھی نہیں کیا۔ وہ ایک نچلے متوسط طبقے کا گھرانہ تھا۔ گھرانا اگر روتا بھی تو لگتا تھا اس رونے میں خلوص نہیں ہے۔ اگر ہنستا بھی تھا تو جھوٹ موٹ ہنستا تھا۔ قدرے بڑا ہوا تو انکشاف ہوا کہ رونے ہنسنے کے دوہرے عمل کی یہ ٹریجڈی صرف میرے گھرانے کی نہیں ہے بلکہ پورے نوع انسان کی ٹریجڈی ہے"۔[6]

مصنف نے اپنے گھرانے کا نقشہ کھینچتے ہوئے پورے عہد کی عکاسی کی ہے۔ اس نے اپنی پیدائش کو کوئی غیر معمولی واقعہ بیان نہیں کیا۔ اس کی پیدائش پر فرشتوں نے پھول نہیں برسائے کیونکہ اسی دن گاؤں کے نمبردار کے گھر خداداد خان نام کا لڑکا پیدا ہوا تھا اور فرشتے نمبردار کی حویلی میں پھول برسانے میں مصروف تھے۔ یہاں تک کہ جب اس کے والد کو اس کی پیدائش کی اطلاع دی گئی تو اس میں بھی کوئی جذباتی اثر پیدا نہ ہوا۔ اپنے باپ کے احساسات کو وہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

"میری پیدائش کی اطلاع جب دریا کے ساحل پر کشتی کا دھندا کرنے والے والد صاحب تک پہنچی تو ان پر کوئی خاص جذباتی اثر نہیں ہوا کیونکہ اس کے گھر میں بچے پیدا ہونا تو ایک روٹین سی ہو چکی ہے اور نہ وہ میرا معصوم چہرہ دیکھنے کے لیے بے تاب ہوئے بلکہ کشتی پر بیٹھے تھے حقے کا کش لگاتے ہوئے انگلیوں پر گننے لگے "ایک، دو، تین، چار۔۔۔ ہاں یہ پانچواں بچہ ہے"۔[7]

یہ المیہ پورے معاشرے کا تھا۔ خوشحال اور متمول گھرانوں میں بچوں کی پیدائش پر خوشی منائی جاتی ہے۔ مقہور و غریبوں کے گھروں میں بچہ پیدا ہونے سے بوجھ میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ بلکہ عام طبقے میں بچے کی پیدائش ایسے ہوتی تھی جیسے بلیوں کے بلونگڑے، بکریوں، بھیڑوں، مرغیوں کے بچے پیدا ہوتے۔ فکر تونسوی نے اس وقت کی سماجی صورت حال کو انسانوں کے بچوں کے پیدا ہونے اور جانوروں کے بچوں کی پیدائش کا موازنہ کر کے اس عہد کا تلخ سماجی چہرہ پیش کیا ہے۔ تقریباً ایک صدی گزرنے کے بعد بھی سماج کے رویوں اور اقتصادیات میں زیادہ تبدیلی پیدا نہیں ہوتی۔ غریب گھرانوں میں اب بھی بچے کی پیدائش کا کوئی نوٹس نہیں لیا جاتا۔ فکر نے اپنے والدہ کی شرافت کا بار بار پراپیگنڈہ کیا ہے۔ مگر اس شرافت کے پراپیگنڈے میں تفاخر یا تعریف نہیں طنز ہے۔ فکر کے والد چودھری جاگیر سنگھ کے ملازم تھے۔ جس نے فکر کے والد کو دریا پر مچھلیاں پکڑنے کے لیے ایک کشتی دان کر رکھی ہے۔ جس کی مرمت کے اخراجات بھی اسی کشتی کی آمدنی سے منہا کی جاتی ہے۔ مگر وہ شرافت سے اس تھوڑی سی آمدنی پر اکتفا کیے جاتے ہیں۔ مگر گھر میں آکر اُسے گالیاں دیتے ہیں۔ اس طرح چوھدری دھان سنگھ کے ہاں میر منشی ہیں مگر اپنی شرافت سے وہاں بھی جگہ نہیں بنا پاتے جس کی وجہ سے اس کے خاندان کو بھوک اور افلاس کا سامنا کرنا پڑ رہا۔

"اور والد صاحب سردار جاگیر سنگھ کے استبداد کو پھر برداشت کرنے کے لیے دوسرے دن صبح دریا کے ساحل کی طرف چلے جاتے۔ جاگیر سنگھ کو گالیاں نکالنے سے تو گھر کے لیے دو روٹیاں نہیں آئیں گی۔ روٹیاں تو استبداد کی کوکھ سے اگتی ہیں۔ اس لیے باوجود جاگیر سنگھ کو برداشت نہ کرنے کے اس کی کشتیوں کی نوکری کو برداشت کرتے چلے جاتے"۔[8]

اس کے والد کی شرافت کے نتیجے میں ان کے گھر کی معاشی طاقت گھر کی دو بکریوں سے آگے کبھی نہیں بڑھی تھی۔ فکر ایسی شرافت کو پسند نہیں کرتے۔ وہ ایسی شرافت کو حماقت سے تشبیہ دیتے ہیں۔

"مگر شرافت نفس کو کبھی ممتاز مقام نہیں ملتا۔ زیادہ سے زیادہ اسے ایک معمولی خوبی تصور کیا جاتا ہے جو گاہے گاہے کام آجاتی ہے۔ اکثر کام نہیں آتی مثلاً میرے والد صاحب کو محض احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور محض احترام والد صاحب کے کبھی کام نہیں آیا"۔[9]

فکر کے والد تونسہ کے قصبہ منگروٹھہ سے کوہ سلیمان کی پہاڑیوں میں دکان بنا لیتے ہیں اور میدان سے گڑ، تیل، نمک لے کر بیچتے ہیں تو ان کے احترام میں کافی اضافہ ہو جاتا ہے۔ وہ شرافت والا احترام نہیں تھا حقیقی احترام تھا جو استبدادیت سے پیدا ہوتا ہے۔ فکر کے والد پہاڑی سادہ لوح بلوچوں کا استحصال شروع کر دیتے ہیں اس سے ان کے گھر پر توہن برستا ہے۔ ایک دنبہ کی پشم کے برابر جب نمک کو تولا جاتا ہے تو فکر اس استحصال کو برداشت نہیں کر سکتا۔

"بہر کیف میں دنبے کی اون کے بدلے میں نمک تولنے لگا لیکن تولتے تولتے نہ جانے آسمان کے کس نیلگوں کونے سے ایک ستارہ سا ابھرا اور وہ ستارہ سیدھے میرے ذہن میں ایک ضرب سی لگاتا چلا گیا۔ کیا میں والد صاحب سے یہ عرض کرنے کی گستاخی کروں کہ نمک اور دنبے کی پشم کے وزن میں تو کوئی فرق نہیں لیکن نرخ میں ایک اور دس کا فرق کیوں ہے۔ نمک تین روپے من خریدا گیا تھا۔ دنبے کی اون تیس روپے من بیچی جائے گی"۔[10]

فکر کے والد نے آہستہ آہستہ شرافت کو چھوڑ کر تجارت اختیار کر لی کیونکہ شرافت اور تجارت ساتھ ساتھ نہیں چل سکتی۔ اس کے والد نے اون کے بدلے نمک دے کر بھی شفاف بلوچوں کا استحصال کیا اور نور شاہ کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے پانچ روپے کی دوائی پچاسی روپے میں یا ایک گائے کے بدلے بیچنی شروع کر دی۔ فکر نے حقائق کو مسخ کرنے کی کوشش نہیں جو چیز انہیں بری لگی اس کا برملا اظہار کیا اور اپنے والد کی تجارت کو وسیع تناظر میں بیان کرتے ہوئے کہا کہ ہر سرمایہ دار کی ترقی غریبوں کی لوٹ کھسوٹ سے پیدا ہوتی ہے۔

"میں یہ کہہ کر (خاکم بدہن) قبلہ والد صاحب کی بدخوئی نہیں کر رہا۔ والد صاحب نہایت شریف اور مرنجان مرنج انسان تھے۔ لیکن ماحول ان کی شرافت کو آہستہ آہستہ چھوڑ رہا تھا اور تجارت؟ تجارت کے جس راستے پر وہ پاپی پیٹ کے مارے گامزن تھے۔ اس راستے پر شرافت کے کشتوں کے کئی پشتے لگ جاتے ہیں"۔[11]

فکر نے اپنے والد کی شخصیت کے مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں کو بیان کیا۔ جس سے اس دور کے بلند اخلاق اور مذہبی رواداری کا پتا چلتا ہے۔ اس کے والد کو جب فکر کے بڑے بھائی ڈھولن اور نوراں کے عشق سے متعلق اور ان کے ملنے ملانے کا یقین ہوتا ہے تو وہ ڈھولن کو گھر سے نکال دیتا ہے۔ اس طرح جب خواجہ شاہ سلیمان تونسوی کا مجاور ذعبداللہ سار بان کی کمزور اور ضعیف بکری قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے تو یہ بات فکر کو بہت ناگوار گزرتی ہے۔ فکر اپنے والد سے اس بے چینی کا اظہار کرتا ہے تو وہ اس سے کہتا ہے:

"چپ ایسی باتیں مقدس خواجگاں کے متعلق نہیں سوچا کرتے۔ وہ تو بنی نوع انسان کا بھلا کرنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ انہیں خداوند کریم سے بھلائی کرنے کے لیے خاص حقوق دے رکھے ہیں۔ ہم تو ان خواجگاں کے مقابلے میں حقیر کیڑے مکوڑے ہیں۔ خبردار، جو ان کی شان میں ایسا کوئی گستاخانہ لفظ نکالا"۔[12]

فکر نے جہاں اپنے والد کی مذہبی رواداری اور احترام کو قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے وہاں خانقاہوں پر بیٹھنے والے مجاروں کو بھی نفرت کی نظر سے دیکھا ہے۔ جو سادہ لوح عبداللہ سار بانوں سے صحت مند موٹے دنبہ کا تقاضا کرتے ہیں۔

"عقیدت کی آڑ میں استحصال کرنے والے لوگ مقدس درگاہوں کو بھی اسٹاک ایکس چینج کا درجہ دے دیتے ہیں۔ میں اسی دہلی شہر میں ایک مقدس پیر کی خانقا کے مجاور کو جانتا ہوں جو ہر روز سینکڑوں سیدھے سادھے عقیدت کے مارے عبداللہ سار بانوں کے نذرانے قبول کرتا ہے اور تین بلڈنگوں، چار کارخانوں اور پانچ بیویوں کا مالک ہے"۔[13]

انسان جہاں پیدا ہوتا ہے اس جنم بھومی سے انسان کو لگاؤ ایک فطری بات ہے مگر فکر تونسوی کو تونسہ شریف اور اپنے گاؤں سے عجیب طرح کی محبت تھی۔ فکر نے تمام عمر اپنے نام کے ساتھ تونسوی کا لاحقہ لگائے رکھا۔ وہ دہلی میں رہ کر بھی تونسوی ہی رہا اور اس کا گاؤں ہمیشہ تونسہ رہا کیونکہ تونسہ شریف کی مٹی نے اسے عاجزی، مذہبی رواداری، استحصال سے نفرت عطا کی تھی۔ وہ جہاں بھی پیدا ہوتا فکر تونسوی بن کر زندہ رہتا۔ فکر نے اپنی آپ بیتی میں اپنے گاؤں سے بھرپور محبت کا اظہار کیا ہے۔

"جیسا کہ میں نے کہا ہمارا گاؤں ملک ہندوستان کا آخری گاؤں تھا۔ آج کل وہ ملک پاکستان کا آخری گاؤں ہے۔ ملک بدل جاتے ہیں۔ سلطنتیں

بدل جاتی ہیں۔ حاکم بدل جاتے ہیں مگر گاؤں نہیں بدلتے۔ ان کے نام کبھی نہیں بدلتے۔ ان کے کردار نہیں بدلتے۔ وہ صدیوں تک گاؤں ہی رہتے ہیں"۔[14]

فکر نے اپنے گاؤں کا ذکر کرتے ہوئے جہاں اپنی جنم بھومی سے محبت کا اظہار کیا ہے وہاں گاؤں کی قدریں، سماج، رہن سہن، ذرائع معاش، رومانس، اچھے برے کردار، جوار باجرہ کے کھیت کھلیاں، کنویں، دوست احباب، سکول کے سنگی ساتھی، الٰہ داد، ٹوپن داس، اساتذہ، نمبردار، قاضی، گاؤں کی روایات، اخلاقیات، چور، موچی، کمار، البیلے نوجوان عاشق، غربت، امارت سب کچھ بیان کیا ہے:

"تین برس سے میں آج کل دہلی میں رہتا ہوں مگر دہلی کو اپنا گاؤں نہیں کہتا۔ میرا گاؤں اب بھی وہی ہے جہاں میں پیدا ہوا تھا۔ میرے پیدا ہوتے ہی میرے گاؤں کی صدیوں کی روایات بھی میرے ساتھ پیدا ہو گئی تھیں۔ عمیق گہرائیوں میں پھیلی ہوئی جڑیں تھیں جو میرے گاؤں کے ہر باشندے کے جسم و روح میں پیوست تھیں۔ متحرک تھیں مرتی ہی نہیں تھیں"۔[15]

تونسہ شریف کے اس گاؤں میں ہندو اور مسلمان مل کر رہتے تھے۔ گاؤں کے چار کنویں تھے۔ جہاں سے ہندو اور مسلمان گھرانے اپنے مٹکے بھر بھر کر لاتے تھے۔ وہاں ہندو اور مسلمان پانی کا کوئی جھگڑا نہیں۔ لوگ ہندو اور مسلمان کی نفرت سے آگاہ ہی نہیں تھے۔ ان کی تو تمام قدریں مشترک تھی۔ ساڑھے تین سو گھرانوں میں ایک سو گھرانے ہندؤں کے تھے۔ گاؤں میں چار پانچ دکانیں تھیں جو ہندؤں کی تھیں۔ جہاں سے ہندو اور مسلمان مرد، عورتیں، چھوکرے، چھوکریاں سودا سلف لے کر جاتے۔

"ایک عورت کپڑے میں اناج کا سیر دو سیر باندھے دکان پر پہنچ جاتی۔ کہتی "لالہ! مجھے گڑ، نمک اور بیسن دے دو، او جی بھاگ ونتی! کتنا گڑ نمک چاہیے۔ میں تو کچھ نہ جانوں۔ میرا اناج تول کر رکھ لے۔ اسی حساب سے سچو سچی جتنا گڑ اور نمک بنتا ہے مجھے دے دے"۔[16]

اس گاؤں میں امن تھا، انسانیت تھی، احترام تھا۔ اس گاؤں میں رومان بھی ہوتے، ڈھولن اور نوراں کا رومان، فکر کا بھراواں سے رومان، ڈھولن داس کا پھولاں سے، چمپا کا خیراتی سے رومان، مگر یہ مقدس رومان تھے۔ یہ رومان اخلاق کی اس پستی تک کبھی نہ جاتے جس سے گاؤں کو رسوا ہونا پڑے۔

"ہاں ہمارے گاؤں میں کبھی کبھی عشق کی ٹن ضرور سنائی دی جاتی تھی۔ لیکن اس کے بعد کوئی ہیر و نہ بنتا، کوئی ڈھولن، کوئی خیراتی، کوئی تیرتھ داس، کوئی فرہاد کی طرح نہر نہ کھودتا، کوئی پنوں کی طرح ڈاچی پر پھولاں کو بھگا نہ لے جاتا۔ گاؤں کی روایتی تہذیب کی زنجیریں، اتنی مضبوط تھیں کہ انہیں دو چار کنکروں سے نہیں توڑا جا سکتا تھا"۔[17]

فکر کے گاؤں کے چور بھی گاؤں کی عزت مال و ناموس کے محافظ تھے۔ فکر نے سدو چور کے کردار کو پیش کیا ہے۔ جس سے اس زمانے کے بلند اخلاقیات کا پتا چلتا ہے کہ اس زمانے میں چوروں کے بھی اصول تھے۔ سدو اپنی گاؤں سے کبھی چوری نہیں کرتا تھا اور نہ گاؤں کی دھی بہن کو بُری نظر سے دیکھتا تھا۔ اگر کوئی شخص اس گاؤں کی دھی بہن کو بُری نظر سے دیکھتا تو وہ اس کا ہاتھ کاٹ دینے کا عزم رکھتا تھا۔

"گاؤں کی ماں بہنوں کی عزت میری عزت ہے۔ جو بھی انہیں ہاتھ لگائے گا، ہاتھ کاٹ دوں گا۔ اسی ہتھیار سے جس سے میں سیندھ لگاتا ہوں،

جو ہاتھ ماؤں بہنوں کی عزت میں سیندھ لگائے۔ سدو خان اس ہاتھ کے قتلے کر کے رکھ دے گا"۔[18]

جب ایک چور کی اخلاقی بلندی کا یہ عالم ہے وہاں عام لوگ، نیک اور پارسا لوگ اخلاق کی کس بلندی پر فائز ہوں گے۔ فکر تونسوی نے اپنے گاؤں کے خدوخال واضح کرتے ہوئے اس عہد کے پورے سماج کی تہذیبی زندگی کو اجاگر کیا ہے۔ زمانے کے بدلنے اور معاشی ترقی نے ان روایات کو نگل لیا ہے۔ اب یہ روایات خواب بن کر رہ گئی ہیں۔ فکر تونسوی کا یہ گاؤں اگرچہ غربت کی تصویر پیش کرتا ہے مگر فکر کو اس بچھڑے ہوئے گاؤں کی روایات پر فخر ہے۔

"ہاں میرا گاؤں واقعی بچھڑا ہوا تھا کیونکہ وہاں کا کوئی باشندہ ایک دوسرے کا سر نہیں پھوڑتا تھا۔ ایک دوسرے کے کھیت سے لہلہاتی فصل نہیں کاٹ لیتا تھا۔ کوئی کسی کی جیب نہیں کاٹتا تھا"۔[19]

قاضی جو مسلم معاشرے میں انصاف کا سمبل تھا۔ اگرچہ انگریزوں کے دور میں یہ کردار قاضی سے پٹواری میں تبدیل ہو گیا تھا۔ مگر گاؤں میں قاضی عبدالرحمن کا بڑا دبدبہ تھا۔

"جب قاضی عبدالرحمن اپنی ڈاچی پر سوار، سر پر کلاہ دار پگڑی باندھے، مونچھوں پر خواہ مخواہ تاؤ دیتے ہوئے گزر جاتا تو یہ خواب ناک گاؤں دو چار لمحے کے لیے چونک اٹھتا۔ اسے سلام کرتا اور پھر اسی خاموشی کے ساتھ جینے میں مصروف ہو جاتا"۔[20]

قاضی عبدالرحمن ریاست کا نمائندہ تھا اس لیے لوگ سرکار کو سلام کرنے کے لیے سروقد کھڑے ہو جاتے۔ قاضی عبدالرحمن کے اس قدر احترام سے ظاہر ہو جاتا کہ انگریز کی سلطنت کا کس طرح رعب، دبدبہ اور خوف تھا۔

فکر تونسوی نے جن اساتذہ سے تعلیم حاصل کی ان میں ہندو اور مسلمان دونوں اساتذہ شامل تھے۔ مولوی صالح محمد، علی محمد، پرس رام، پریتم داس مگر کسی استاد نے ان کو ہندو اور مسلم کے درمیان تعصب کا احساس نہیں دلایا۔ وہ خود بھی پیار محبت سے رہتے ایک چادر پر مولیاں رکھ کر کھاتے اور مل کر وارث شاہ کی کافیاں اور بھگت کبیر کے دوھے پڑھتے مگر کبھی انہوں نے یہ سبق نہ پڑھایا کہ ہندو دکان دار مسلمان کو لوٹتا ہے یہ سبق تو خیر محمد بلوچ نے دیا تھا جو ڈیرہ غازیخان سے عالم و فاضل بن کر آیا تھا۔ اس نے پہلی بار تیل، تمباکو، نمک اور دال کو کلمہ پڑھایا اور مسلم دکان کھول کر مسلمانوں کو لوٹنے لگا۔ جب فسادات ہوئے تو گاؤں کے لوگ ہندؤں کے اس طرح وطن چھوڑنے پر اداس تھے۔ جاتے ہوئے رام پیاری اپنا گھڑا عائشاں کو دے گئی اور عائشاں نے رس بھرے باجرے کے بھٹے رام پیاری کی گٹھڑی میں ڈال دیئے۔

فکر تونسوی طنز نگار تھے۔ اس لیے اپنی آپ بیتی میں طنز کرنے سے نہیں چوکتے اور جابجا طنزیہ جملے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ فکر تونسوی کی مادری زبان سرائیکی تھی، اس نے اپنی آپ بیتی میں سرائیکی کے الفاظ استعمال کر کے سرائیکی ثقافت کو نمایاں کیا ہے۔ بلونگڑا، کراری گالیاں، موزی، اوبڑ کھابڑ، چھجلی، پرانٹھے، اللہ اللہ خیر سلہ، ہڈ پیر، کچاوا، ڈاچی، اجڑے پجڑے، ٹانگری، سیندھ، نویں نکور، محرقہ، جنانی، چونڈھی، گٹ وٹ، جھونگا، چخ چخ، لک تھپ، یرکا وغیرہ اس طرح کے سینکڑوں الفاظ ملتے ہیں۔ فکر تونسوی نے مردوں اور عورتوں کے جو نام کرداروں کی صورت میں بیان کیے ہیں، ان سے بھی سرائیکی ثقافت کی عکاسی ہوتی ہے۔ پھاتو، رحمت کمار، بھراواں، عائشاں، ٹوپن داس، الٰہ داد، خدابخش، ڈھولن، نوراں، سولاں،

فیضا، فرازو، جبرا، فوجاں، رلخی، مہرو، جمعہ نائی ایسے ناموں سے ویسے تو نسہ شریف کی ثقافت اور کلچر ابھر کر سامنے جاتا ہے۔

فکر تونسوی ترقی پسند اور کمیونسٹ تھے۔ وہ اپنے نظریات بھی بیان کرتے ہیں اور ہر چیز کو ترقی پسند نظر سے دیکھتے ہیں۔ اس کی آپ بیتی پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ نظریات اُسے تونسہ شریف کی سرزمین نے عطا کیے تھے۔ اوائل عمری سے اسے غربت افلاس، روایتی زندگی، توہم پرستی جیسی سماجی جکڑ بندیوں سے نفرت تھی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ وزیر کا میٹرک فیل بیٹا وزیر بنے اور موچی کا میٹرک پاس بیٹا موچی کے آسن میں بیٹھ کر جوتے گانٹھے۔ اس طرح جب اس کا والد غوثے بلوچ کے نومولود بیمار بچے کی دوائی کا معاوضہ ایک دودھینی گائے مانگتا ہے تو فکر اس بے انصافی پر سو نہیں سکتا۔

"میں چپ ہو گیا، سو گیا۔ رات کی گہری پرچھائیاں ہر غوثے، ہر زچہ اور ہر بچہ پر موت کی تاریکی بن کر چھا گئیں۔ لیکن میرے اندر کا شاعر نہ سو سکا۔ یہ جھوٹ ہے، اختراع ہے، دغابازی ہے، بے رحمی ہے، استحصال ہے، غریب بلوچ کا استحصال، اس کی اَن پڑھتا اور بے بسی کا استحصال اور جب میں بڑا ہوا تو مجھے پورے سماج میں اس استحصال کی تاریکیاں نظر آئیں۔ استحصال کا مفہوم معلوم ہوا"۔[21]

فکر کی آپ بیتی کا وہ حصہ جس میں وہ اپنے والد کے ساتھ کوہ سلیمان کی پہاڑیوں میں چلا جاتا ہے۔ بہت جاندار ہے اور فکر کا اسلوب بھی شباب پر ہے۔ اپنے آبائی گاؤں سے جاتے ہوئے اُسے کوہ سلیمان کی پہاڑیوں کا دلکش حسن بہت اچھا لگا۔ فکر نے اپنی خود نوشت میں پہاڑوں کے رسم ورواج، روایات، سادگی، سچائی، تمنداری نظام، کالا کالی رسم جیسے تمام ثقافتی و سماجی اسرار و رموز کو بیان کیا۔ اگرچہ کوہ سلیمان کے پہاڑوں میں فکر نے بہت کم وقت گزارا لیکن اس مختصر عرصے میں اس نے پہاڑوں کے بلوچ قبائل کی روح کو سمجھ لیا۔ اس سے فکر کے مشاہدہ اور حافظہ کی داد دینا پڑتی ہے۔ فکر نے پہاڑوں میں پروان چڑھنے والے رومانوں کو بھی دلکش انداز میں بیان کیا ہے۔ عبداللہ ساربان جس کے اونٹوں پر وہ نمک تیل سودا سلف لاد کر منگروٹھہ سے پہاڑ کی جانب آئے تھے، اس کی بیٹی عائشاں جس کا شوہر کسی اور لڑکی کے ساتھ کالا ہو گیا ہے۔ اب وہ اور اس کا باپ خواجہ شاہ سلیمان کے مزار پر منت مانگنے گئے تھے کہ عائشاں کا شوہر لوٹ آئے۔ فکر نے عائشاں کے حسن اور اس کے مسائل بتا کر بلوچ قبائل کے حسن اور رسم ورواج کو بیان کیا ہے۔ فکر نے عائشاں کے ساتھ اپنے رومان کو بھی بیان کیا ہے۔ عائشاں کے رومان کی وجہ سے فکر کے والد نے اُسے واپس اپنے آبائی گاؤں بھیج دیا کہ کہیں وہ بلوچ قوم کی غیرت کا شکار نہ ہو جائے۔

"ایک تو والد صاحب کو یہ خطرہ لاحق ہوا کہ کہیں کوہ سلیمان کی ان پہاڑیوں کی کھلی رومانٹک فضا مجھے کسی بلوچی دوشیزہ کے عشق کا روگ نہ لگا دے۔ کیونکہ میں نے پہاڑی جھرنوں اور رسیلے پیلوؤں کے پیڑوں کے نیچے بیٹھ کر غزلوں کے شعر لکھنا شروع کر دیئے تھے۔ بلکہ دو تین قطعے تو میں نے عبداللہ ساربان کی بیٹی عائشاں کے ہجر میں بھی قلم بند کیے تھے"۔[22]

جب عبداللہ ساربان کا یہ قافلہ گڑ، تیل، نمک، کپڑے کے گٹھڑے لے کر پہاڑی چھب پر اترا تو بلوچوں کے مرجھائے ہوئے چہرے دمک اٹھے۔ فکر نے اونٹوں کے اس سامان کو امریکہ سے گندم سے بھرا ہوئے جہاز سے تشبیہ دی ہے۔ تمام بلوچ فکر کے والد کی چھب پر جمع ہو گئے۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ سیٹھ زادہ بھی ہمراہ ہے تو انہوں نے پُرتپاک طریقے سے فکر کا استقبال کیا اور تھوڑی دیر کے لیے گھروں

کو چلے گئے۔ جب واپس آئے تو ہر شخص فکر کے لیے کوئی نہ کوئی سوغات لے کر آیا۔

"میں نے دیکھا کہ اس چھوٹے سے تمن کا ہر شخص کچھ نہ کچھ لے کر میری طرف آرہا ہے، گھی، آٹا، اُون کا گٹھا، ارڈھ کی ڈلی، مونگ کی پھلیاں، جوار کے پکے ہوئے بھٹے، بیلو کی ٹوکری، لیلے کا گوشت، مرغی کا چوزہ، رسیوں سے بنی ہوئی انٹی، شہد کا اترا ہوا چھتا۔ غرض جو شخص کہ جس چیز کے قابل نظر آیا۔ میری خدمت میں لا کر حاضر ہو گیا"۔[23]

اس سے بلوچوں کی روایتی مہمان نوازی اور بڑا پن ظاہر ہوتا ہے۔ بلوچ قبائل میں یا سرائیکی وسیب میں جب کوئی کچھ دن کے لیے باہر جاتا تو واپس آکر حال سنتا اور سناتا ہے۔ فکر کے والد جب میدان سے لوٹے تو مُلا گنڈک جو فکر کے والد کا یار بیلی ہے۔ پہاڑ کا حال یوں بیان کرتا ہے: "سائیں میر ادھنپت سیٹھ! تمندار ولی خان کی گھوڑی نے دو بچھڑے دیئے ہیں۔ اُدھر گاما وھاڑی کی چڑھائی پر بخشو بیچارے کی دو بکریاں ایک پتھر لڑھکنے سے شہید ہو گئیں۔ باقی اللہ کا فضل ہے۔ گاہدی سرخ مونچھوں والا اترا تا ہوا کہتا پھرتا ہے کہ عبدالغفور کی طلاق یافتہ چھوکری کو وہ اپنی نیلی گھوڑی پر بھگا لے جائے گا۔ ہم نے اسے سندیسہ بھیج دیا ہے کہ ہم تمہاری ہڈیوں کو سرمہ بنانے کا انتظار کر رہے ہیں۔ باقی پینے کے پانی والے تالاب میں باچھو کی گائے مر گئی ہے۔ سبھی بلوچ، بلوچیاں ساڑھے پانچ کوس نیچے تاختی تالے سے پانی کی چھاگلیں بھر کر لا رہی ہیں۔ اللہ امین ہے، بارش چھینٹا پڑ جائے تو یہ دلدل ختم ہو۔۔۔ عبداللہ کی بیٹی عائشاں کا وہ سالا عاشق جو سیاہ ہو گیا تھا۔ سنا ہے اسے ایک سیاہ سانپ نے ڈس لیا ہے"۔[24]

یہ فکر کی خودنوشت نہیں ہے بلکہ تونسہ اور اس کے ارد گرد کے میدان اور کوہ سلیمان کے پہاڑوں میں بسنے والے تمام قبائل کی سر گزشت ہے۔ فکر کے اندر ایک فنکار، شاعر اور ادیب چھپا ہوا تھا۔ اس لیے تجارت کے لیے اس کی طبیعت موزوں نہ تھی۔ وہ ترازو میں ڈنڈی نہیں مار سکتا تھا۔ وہ پانچ روپے کے ست گلو پچاسی روپے میں نہیں بیچ سکتا تھا۔ وہ اون کی نرم پشم کے بدلے نمک نہیں تول سکتا۔ اس لیے وہ میدان کو لوٹا آیا اور نئے راستے کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ جہاں اس کا اگلا پڑاؤ لائل پور تھا۔ اس صنعتی اور عظیم شہر میں تنہا فکر تونسوی نے زندگی کی جدوجہد کے لیے کئی پاپڑ بیلے۔ یہاں اسے کئی مہربان میسر آئے جنھوں نے بے سہارا فکر تونسوی کو سائباں میسر کیا۔ یہاں اس نے کئی پیشے اختیار کیے۔ مگر دو وقت کی روٹی بھی میسر نہ آئی۔ پھر قسمت انہیں شیخوپورہ لے آئی۔ یہاں ایک اخبار کے دفتر میں کام کیا۔ نامردی دور کرنے والے تیل بیچے۔ رنگ ریزی کی۔ یہاں اُسے لالہ صحرائی مولوی صادق جیسا فرشتہ صفت انسان ملا جس نے اسے اپنی کٹیا میں پناہ دی اور محبت کا درس دیا۔ بالآخر لالہ صحرائی مولوی صادق اس کے لیے خوشی کا پیغام لایا جس نے فکر کی قسمت بدل ڈالی۔ بدقسمتی کے دن رخصت ہوئے اور لالہ صحرائی نے اسے ایک دن بتایا کہ تمہاری نظم کو اعلیٰ ادبی رسالے "ادبی دنیا" نے سال کی بہترین نظموں میں شمار کیا ہے۔ مولوی صادق فکر کو ادب لطیف کے ایڈیٹر چودھری نذیر کے پاس لے آیا اور فکر کی زندگی کے نئے دور کا آغاز ہوا۔

"لاہور میں آنے کے ایک دو برس بعد ہی میں اپنے آپ کو سپیریئر سمجھنے لگا مگر اس احتیاط کے ساتھ کہ اپنی برتری کا اظہار نہ کرتا مگر باطنی طور پر اپنے آپ کو سپیریئر سمجھ کر اطمینان قلب حاصل کر لیتا"۔[25]

فکر نے لاہور کی خوش گوار یادوں کو رشک سے بیان کیا۔ فکر لاہور کو کبھی نہ بھلا سکے۔ داتا کی نگری کا ہر ذرہ اس کے لیے دیوتا تھا۔ لاہور میں ان کا ایک ادبی حلقہ بن گیا تھا۔ جہاں خوش گپیاں ہوتی، ادبی مذاکرے و مباحثے ہوئے، آوارہ گردی کے دن کافی ہاؤسوں میں گزرتے، کوئی فکر نہیں، ترقی پسندانہ نظریات ان کی آماجگاہ تھے۔ زندگی بڑے لطف سے گزر رہی تھی۔ مگر اچانک گرم ہوا کے تیز جھونکوں نے اس کے خوابوں کی یہ دیوار گرادی۔

فکر کی آپ بیتی کا پہلا حصہ پیدائش سے لے کر ادبی زندگی کے باقاعدہ آغاز تک ہے۔ اس حصے میں اس نے اپنی زندگی کے ورق ورق کو پوری جزئیات کے ساتھ پیش کیا ہے۔ فکر تونسوی نے اپنی بقیہ زندگی کو اپنی خودنوشت کے دوسرے حصے ''میری بیوی'' میں پیش کیا ہے۔ فکر کی تحریروں میں اس کی بیوی کا ذکر اس کثرت سے ہے کہ شاید ہی کوئی ایسی تحریر ہو جو اس سے بیوی ے ذکر سے خالی ہو۔ دراصل فکر کے نزدیک بیوی انسان کی شخصیت کا حصہ ہوتی ہے۔ اس کے بیان کے بغیر شاید آپ بیتی بھی مکمل نہیں ہو سکتی۔ اس لیے اس نے دوسرے کا نام "میری بیوی" رکھا۔ دوسرا حصہ دو سو اسی صفحات پر محیط ہے اور اس میں درج ذیل عنوانات ہیں:

جب اس نے جنم لیا۔ معلومات ناقص ہیں۔ لونگ دا الشکارا۔ میم ایک تخلص۔ پوری تہذیب کا فاصلہ۔ چور سے شادی۔ خاوند پہلے، بیوی بعد میں۔ شاعر اور گو بھی۔ اور میں رو دیا۔ اور رونا بیوی کا بھی۔ بلاؤز کا اچار۔ مصور۔ ایک مکھن۔ کافر کے گھر شیو جی۔ دو دونی چار۔ غداری۔ غلامی۔ آزادی۔ ساڑی اور فساد۔ باقاعدگی کا جھاڑو۔ کوکھ میں آئینہ۔ ساس۔ پھر تنہائی کا سناٹا۔ لاہور کی ڈارلنگ۔ کوشلیا دھوبن کی پیش گوئی۔ اور میں ہندو بنا۔ کیمپ کا دوزخ۔ بیٹی کی قاتل ماں۔ رفیوجی رفیوجی۔ بھائی بھائی۔ خاوند۔ ایک رفیوجی کیمپ۔ گھوڑے کے اصطبل میں۔ انقلاب۔ ایک تیز دوائی۔ کچن کے لیے روپے۔ تو تو، میں میں۔ ادب اب سرکار لکھے گی۔ سوشلزم کی تجارت۔ نائی والی گلی میں۔ پانچ روپے میں پانچ ادیب۔ روٹیاں۔ صنفی رومانس۔ ریٹ کے بٹے۔ پتھریلے گاؤں۔ بیس روپے میں بیوی۔ دوبارہ دہلی میں۔ میرا دوسرا جنم۔ مجھے دیسی گھی ملنے لگا۔ پھر سیلاب آ گیا۔ سیلاب سے کیسے نکلے۔ جیب اور فلیٹ۔ قلم بھی کام آیا۔ زندہ سماج۔ سچے دشمن۔ جھوٹے دوست۔ ہریجن لڑکی والا گاندھی۔ تغیر، تغیر، تغیر۔ اور مجھے ادھر نگ ہو گیا۔ ہسپتال میں آدھا آدمی۔ ہسپتال میں رومانس۔ سوشلزم کو بھی فالج۔ ادھورا نروان۔ میرا مونولاگ۔

فکر نے دوسرے حصے میں بظاہر تو بیوی کے حالات بیان کیے ہیں اور اُسے ''میری بیوی'' کا نام دیا ہے۔ اس حصے میں اس نے اپنی بیوی کے جنم سے لے کر بچپن، لڑکپن، گاؤں کی زندگی، دیہاتی تہذیب، دیہاتی عورت کی جفاکشی، وفاداری سے لے کر تمام عمر اس کے ساتھ بتائے ہوئے لمحات کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ خاوند اور بیوی ایک زندگی کے دو رُخ ہوتے ہیں۔ بیوی زندگی کے داخلی حالات کو ظاہر کرتی ہے اور خاوند کے حالات خارجی حالات کی عکاسی ہوتے ہیں۔ فکر میاں بیوی کو ایک شخصیت شمار کرتے ہیں۔ فکر کی بیوی کے حالات زندگی فکر کے ہی حالا ت زندگی ہیں۔ فکر کو اپنی بیوی کا کردار بے حد پسند تھا۔ وہ اپنی بیوی کی شخصیت میں ہر ہندوستانی عورت کی وفاشعاری، بہادری، پاکیزگی، گرہستی دیکھتے ہیں۔

فکر نے آپ بیتی کے علاوہ بے شمار تحریروں میں بیوی کی آڑ میں ہندوستانی عورت کی خوبیوں اور خامیوں کو بیان کیا ہے۔ فکر کی بیوی کا دین دھرم، بھگوان خدا سب کچھ اس کا پتی، اولاد اور گھر ہے۔ اُسے کمیونسٹ انقلاب سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اُسے اپنے گھر میں سبزی، آٹا، دال لانے کی فکر ہے۔ بلکہ وہ انقلاب کی مخالف ہے۔ کیونکہ فکر نے ہندوستان میں انقلاب لانے کے لیے زندگی کے ابتدائی دنوں میں بیوی بچوں کا استحصال کیا۔ جب تک ان پر انقلاب کی دھن سوار رہی۔ اس کے بچے انگور، دودھ اور دیسی گھی سے محروم رہے۔ فکر کی بیوی ایک مثالی بیوی ہے۔ پہلے خاوند کو کھانا کھلاتی ہے پھر خود کھاتی ہے۔ وہ اپنے گھر کو دھرم، مندر اور انقلاب سے بلند پایہ سمجھتی ہے۔ وہ اَن پڑھ ہے مگر اس کا خانگی شعور پڑھی لکھی خاتون سے زیادہ ہے۔ وہ اَن پڑھ ہے اس لیے اس کے اندر کوئی تعصب نہیں۔ فکر تونسوی نے اپنی بیوی کے حالات اس کے جنم سے شروع کیے لیکن پیدا ہوتے ہی اس کی بیوی کے ساتھ ٹریجڈی ہو گئی۔ جس دن وہ پیدا ہوئی اسی دن نمبر دار سردار خداداد کے گھر بھی لڑکا پیدا ہوا۔ اس لیے میں ان لمحات کو جب فکر کی بیوی کی ماں دردِ زہ سے چیخیں مار رہی تھی۔ اس کا والد نمبر دار کو بیٹے کی پیدائش پر ہدیہ تہنیت پیش کرنے کے لیے چلا گیا۔

"اگرچہ میری بیوی اور نمبر دار کے بیٹے کی پیدائش میں فقط چند لمحوں کا فاصلہ تھا مگر دراصل چند صدیوں کا فاصلہ تھا۔ صدیوں گزری مگر نمبر دار اور مزارع کا فاصلہ کم نہ ہوا۔ چنانچہ شاید اس فاصلہ کو قائم رکھنے کے لیے میری بیوی کے والد صاحب نے پستے میں رچا ہوا، ایک سیر گڑ گرہ میں باندھا اور عین اس وقت جب اس کی بیوی دردِ زہ سے چند آخری چیخیں مار رہی تھی۔ میری بیوی کے والد صاحب نمبر دار کو ہدیہ تہنیت دینے کے لیے اس کی حویلی کی طرف روانہ ہو گئے"۔[26]

سندر لال کو جب بیٹی کی پیدائش کی اطلاع دی گئی تو وہ خوش نہیں ہوا بلکہ سوسائٹی کے ہر فرد کی طرح افسردگی اس کے چہرے پر چھا گئی۔ فکر غیر روایتی، ترقی پسند ادیب تھے۔ عورت سے رکھے جانے والے ناروا سلوک سے اُسے دکھ پہنچتا تھا۔ بیٹی کی پیدائش کو نحوست کہنے والوں پر انہیں افسوس ہوتا ہے۔ بیٹی کی پیدائش کو آج بھی بابرکت نہیں سمجھا جاتا۔ فکر نے تو قیام پاکستان سے پہلے کے عورت کے بارے میں معاشرے کے تصورات کو بیان کیا ہے:

"گھر لوٹنے پر جب سندر لال کو بیٹی کی ولادت کی خبر ملی تو وہ افسردہ ہو گیا کیونکہ بیٹی کو نحوست کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ یہ علامت صرف ایک لفظ نہیں تھا بلکہ سوسائٹی کی ایک مضبوط لمبی روایت تھی۔ چنانچہ سندر لال کی افسردگی پر کسی نے بُرا نہیں مانا۔ البتہ ہر مرد اور عورت نے ایک کربناک خاموش ہمدردی کا ایک کسیلا گھونٹ سندر لال کو بڑی تسکین ہوئی۔ یہ سوچ کر کہ سارا سماج میرے ہمراہ ہے"۔[27]

فکر تونسوی اپنی بیوی کے حالات بیان کرتے ہوئے سرائیکی خطے کے بالخصوص اور ہندوستانی معاشرے کی بالعموم عورت یا بیٹی کے بارے میں پائے جانے والے نظریات کو بیان کیا ہے۔ فکر نے اپنی بیوی کے مختلف روپ بیان کیے ہیں۔ وہ بیٹی، بیوی، ماں گرہستی ہر کردار میں خوبصورت اور معاشرے کی خوبصورتی کا باعث ہے۔ فکر اپنی بیوی کی آپ بیتی بیان کرتے ہوئے معاشرے کے بیمار ذہنوں کو یہ پیغام دیتے

ہیں کہ عورت کی تکریم ہر روپ میں واجب ہے۔ جس طرح عورت کے آنے کے ساتھ ہی ایک بدبودار گھر چمک اٹھتا ہے اور اس میں غلاظت کی بجائے سونی سوندھی خوشبو بکھر جاتی ہے۔ اس طرح عورت معاشرے میں خوبصورتی کی علامت ہے۔ فکر کی بیوی کا اصل نام تو کیلاش وتی تھا مگر گاؤں میں وہ اپنے گورے رنگ، سڈول جسم اور بہادری کی وجہ سے میم کے نام سے مشہور تھی۔ فکر نے اپنی بیوی کے جمال و شباب کے ساتھ ساتھ اس کی بہادری کے بھی کئی قصے زیب داستان کیے ہیں۔ فکر تونسوی شادی کے بعد اپنی بیوی کو اپنے ساتھ لاہور لے آتے ہیں، یہاں آکر پہلی بار اس کی بیوی کرایہ دار کے منحوس نام سے متعارف ہوئی۔ فکر ان دنوں سنت نگر میں کرایہ کے مکان میں رہتے تھے۔ فکر کا کمرہ غلاظت سے اٹا ہوا تھا۔ ہر جگہ مکھیوں کی بیٹیں تھیں۔ کتابیں ہر جگہ بکھری ہوئی تھی۔ گھر عجیب ترتیب سے بکھرا ہوا تھا۔ فکر جب حسب معمول سورج نکلنے پر بیدار ہوا تو گھر کو بدلا ہوا پایا:

"میں نے کمرے کے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ یوں لگا میں کسی دوسرے کمرے میں ہوں۔ بدبو غائب، اگربتی کی سوندھی خوشبو، سجے سجائے برتن، ہر شے میں ترتیب، میری کتابیں تک زندہ ہو کر جیسے اذان دے رہی تھی۔ مجھے محسوس ہوا جیسے سوائے میرے کمرے میں کوئی غلاظت نہیں تھی"۔[28]

فکر تونسوی نے اس حصے میں محض اپنی بیوی کے اوصاف نہیں بیان کیے بلکہ بیوی کی آڑ میں دیگر مسائل بھی بیان کیے ہیں۔ جب وہ اپنی بیوی کو لاہور لے آتے ہیں تو لاہور کی سیاسی فضا گرم ہے۔ انگریز کے خلاف تحریکیں زوروں پر ہیں اور آئے دن اُن کے خلاف نعرہ بازی ہوتی رہتی ہے۔ فکر تونسوی ویسے انگریزوں سے نفرت کرتے تھے اور ان کو استحصالی قوت کے طور پر دیکھتے تھے۔

"ہندوستان میں انگریز سامراج کی ایک وسیع نوآبادی تھی جہاں انگریز حکمرانوں نے بنگال کے جلاہوں کے ہاتھ اس جرم میں کاٹ دیئے تھے کہ یہ اتنی نفیس ململ کیوں بناتے ہیں۔ جس کا پورا تھان انگوٹھے کی انگشتری میں سے نکل جاتا ہے۔ برطانیہ کا لنکا شائر ان کے لیے ایک سورج تھا جبکہ کلکتہ کے ملاح ڈوبتے ہوئے تارے لیکن جن دنوں میری بیوی لاہور میں آئی تھی۔ اس نے پہلی بار انقلاب زندہ باد کے نعرے سنے جو ہماری سنت نگر کالونی میں ہر تیسرے چوتھے دن ابھر آتے۔ کالونی کے ہر مرد و زن کی باتوں میں بغاوت کی شعائیں ابھرتیں اور سول لائنز کی خوبصورت انگریز کوٹھیوں کا چکر لگا کر انگریزوں کو "یرکا" آتیں"۔[29]

فکر کی بیوی امید سے ہوئی تو فکر کو آنے والے بچے کی پریشانی لاحق ہوئی تو اس نے اپنی ماں کو لاہور بلا لیا۔ اس کی ماں کے لاہور آنے کے بعد بہو اور ساس میں لڑائی جھگڑے شروع ہوئے۔ فکر نے ان کو وسیع تناظر میں بیان کرتے ہوئے انہیں ہر ساس اور بہو کا جھگڑا بنا کر بیان کیا ہے۔ گھر سے باہر پاکستان اور ہندوستان کے نعرے ایک دوسرے سے نبرد آزما تھے اور گھر کے اندر ساس اور بہو نبرد آزما تھیں۔ ساس اور بہو میں

بھی اقتدار کی جنگ تھی۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"بہر کیف والدہ تشریف لے آئیں۔ چونکہ ساس تھی، بہو کے مقابلہ پر طاقت کا بڑا مرکز، اس لیے اپنے سبھی مروجہ نسخے میری بیوی پر آزمانے لگی۔ یہ کرو، وہ نہ کرو بلکہ کچھ بھی نہ کرو۔ صرف وہی کرو جس کی میں اجازت دوں۔ یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ وہ یہاں میری ماں کم لگتی تھی۔ میری بیوی کی ساس زیادہ لگتی تھی۔ ماں بیٹے کا رشتہ گم ہوتا جا رہا تھا۔ ساس بہو کا رشتہ ابھرتا آ رہا تھا"۔[30]

چنانچہ فکر نے ان جھگڑوں سے تنگ آ کر دونوں ساس بہو کو واپس تونسہ شریف بھیج دیا اور اسی دوران فسادات شروع ہو گئے۔ فکر فسادات کے دنوں کا احوال اپنے رپورتاژ "چھٹا دریا" میں لکھ چکے تھے۔ اس لیے اپنی آپ بیتی میں اس نے فسادات کا ذکر مختصر کیا ہے۔ فکر لاہور کو نہیں چھوڑنا چاہتا تھا اور نہ وہ ہندو بن کر پاکستان چھوڑنا چاہتا تھا۔ وہ ہندو مسلم کی قید سے آزاد تھا۔ اگر ایسے حالات میں کوئی اسے ہندو کہتا اور لاہور چھوڑنے کا مشورہ دیتا تو اسے دُکھ پہنچتا۔ لاہور چھوڑنا اسے غداری معلوم ہوتی ہے۔ مگر اس کی لاہور نہ چھوڑنے کی زبردست خواہش ایک جھوٹ تھا بالآخر فکر حالات کے ہاتھوں مجبور ہو گئے۔

"میں نے ساحر لدھیانوی سے کہا کیا تاریخ کا تقاضا پورا کرنے کے لیے تمہارے پاس لفظ ہندو سے زیادہ ضرر رساں کوئی چیز نہیں ہے۔ وہ بولا ہے کیوں نہیں۔ ایک چھرا ہے اور ایک متعصب غنڈہ جو مسلمان کم اور غنڈہ زیادہ ہوتا ہے۔ وہ تمہاری آنتیں نکال کر تاریخ کا تقاضہ پورا کر دے گا۔ چلو، چلو، بیٹھو، بطور ہندو اس تانگے پر بیٹھو تاکہ ہندوؤں کے رفیوجی کیمپ کا رخ کریں"۔[31]

فکر بوجھل قدموں کے ساتھ رفیوجی کیمپ کی طرف چل پڑا۔ ممتاز مفتی بہت افسردہ ہے، اُسے فکر کے یوں جدا ہونے کا گہرا دکھ ہے۔ چنانچہ لاہور چھوڑے ہوئے وہ جذباتی ہو جاتا ہے:

"میں فوراً جذباتی ہو گیا اور ممتاز مفتی کی گردان میں بانہیں ڈال کر رونے لگا مگر ممتاز مفتی میری طرف منہ کیے بغیر کہتا گیا۔ ارے! تو تو پاگل ہے۔ پاگل بالکل پاگل ہاں پاگل، تو میں بھی ہوں، لیکن دیکھ، پاگل دکھائی نہیں دیتا۔ لوگ جب کسی کو پاگل کہتے ہیں تو اس پر ہنستے ہیں۔ اس لیے سُن، ہمیں پاگل بالکل نظر نہیں آنا چاہیے"۔[32]

فکر نے ان فسادات کے دوران شرنارتھیوں پر ٹوٹنے والوں غموں کو بھی بیان کیا ہے۔ ان غموں سے انسان نے اپنی انسانیت کھو دی۔ وہ احساسات و جذبات سے عاری ہو گئے ہیں۔ بچے اپنی ماؤں کے کلیجوں سے جدا ہو گئے ہیں۔ بیویاں شوہروں سے بچھڑ گئیں ہیں۔ والدین اپنے بچوں کو چھوڑ کر خود ٹرک پر سوار ہو رہے ہیں۔ نفسا نفسی اور افراتفری کا عالم ہے۔ ایک نوجوان لڑکی کیمپ کے برآمدے میں سب کے سامنے پیشاب کرنے بیٹھ گئی ہے۔ فکر کے لیے یہ واقعہ بڑا تکلیف دہ تھا۔

"اسٹیشنوں پر لیڈروں کا آزادی کا اعلان کرنا آسان ہے مگر برآمدے میں ایک نوجوان لڑکی کے پیشاب کرنے کی خبر نشر کرنا انتہائی مشکل ہے"۔[33]

فکر تونسوی ایک صاحب طرز نثر نگار تھے۔ وہ لفظوں کے دروبست اور استعمال کا شاور ہے۔ وہ جس صنف سخن پر قلم اٹھاتا ہے۔ اس کا اسلوب اس کا ساتھ دیتا ہے۔ فکر کی آپ بیتی فکر و فن کے ہر حوالے سے ایک کامیاب آپ بیتی ہے۔ فکر کی آپ بیتی ایک جہد مسلسل ہے۔ اس کی آپ بیتی میں اس کی سوانح و شخصیت کا ہر گوشہ نمایاں نظر آتا ہے۔ اپنا نہیں اپنی بیوی کی شخصیت کو بھی پوری جزئیات کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس کی آپ بیتی صرف اس کے حالات زندگی تک محیط نہیں بلکہ تونسہ شریف سے لاہور، لاہور تا دہلی پورے ہندوستان کی تہذیب و روایت پوری آب و تاب سے نظر آتی ہے۔ اس آپ بیتی میں انسانیت، مذہب اور سیاست کے نام پر عوام سے ہونے والے کھلواڑ کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ دونوں ملکوں کے لوٹ کھسوٹ کے نظام کا پردہ چاک کیا گیا ہے۔ فسادات 1947ء ہندوستان کی تاریخ کی سب سے بڑی لوٹ مار اور خوں ریزی تھی۔ نادر شاہ کی قتل و غارت بھی ان فسادات کے سامنے ماند پڑ جاتی ہے اس لیے فکر نے اس آپ بیتی میں انسان کے بے رحم رویوں کو جابجا ظاہر کیا ہے۔ فکر ایک حقیقت پسند انسان تھے۔ فکر کی شخصیت میں سادگی تھی۔ جھوٹ سے اسے نفرت تھی۔ فکر نے اپنی آپ بیتی میں حقائق کو من و عن بیان کیا ہے۔ فکر نے اپنی ذات کو ویسے پیش کیا جیسے تھی۔ اس میں کہیں تصنع، مبالغہ یا بناوٹ نظر نہیں آتی۔ فکر نے آپ بیتی میں کہیں جانبداری نہیں دکھائی وہ ہندو مسلم کے تعصب سے پاک تھے۔ اس نے فسادات کے بیان میں کہیں نفرت یا جوش دلانے کی کوشش نہیں کی۔

References

1. Quarterly Al Zubair, Autobiography No., Urdu Academy Bahawalpur, 1964, P.45
2. Naqoosh, Autobiography No. June, 1949, P.63
3. Fiker Taunsvi, I, Ahluwalia Book Depu New Rohtik Road New Delhi, 1987, P.4
4. Ibid, P.4-5
5. Ibid, P.5
6. Ibid, P.11
7. Ibid, P.20
8. Ibid, P.18
9. Ibid, P.16
10. Ibid, P.155
11. Ibid, P.170
12. Ibid, P.135
13. Ibid, P.131
14. Ibid, P.27
15. Ibid, P.30

16. Ibid, P.28
17. Ibid, P.95
18. Ibid, P.99
19. Ibid, P.98
20. Ibid, P.98
21. Ibid, P.175
22. Ibid, P.166
23. Ibid, P.145
24. Ibid, P.150
25. Ibid, P.223
26. Fiker Taunsvi, My Wife, Ahluwalia Book Depu New Rohtik Road New Delhi, P.5, 6
27. Ibid, P.6
28. Ibid, P.35
29. Ibid, P.41
30. Ibid, P.88
31. Ibid, P.103
32. Ibid, P.104
33. Ibid, P.107